۵۸۔ کتاب الام، ج ۹، ص ۲۰۴

۵۹۔ کتاب الرد علی سیر الاوزاعی للامام ابی یوسفؒ، ص، ۴۴۔ ۴۵

۶۰۔ بدائع الصنائع، علاء الدین الکاسانی، دار الکتب العلمیۃ بیروت، ۱۴۰۶ھ۔ ۱۹۸۶ء۔ طبع دوم ج ۱۵، ص، ۳۳۷

۶۱۔ ابو داؤد، حدیث: ۲۷۵۳

۶۲۔ دلائل النبوۃ لأبی نعیم الاصبھانی، ج ۱، ص ۹۴ ۴، حدیث: ۳۹۶

۶۳۔ کتاب الرد علی سیر الاوزاعی، حاشیۃ الافغانیؒ، ج ۱، ص ۷۶، السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث: ۱۸۵۸۶

۶۴۔ بغیۃ الباحث عن زوائد مسند الحارث، نور الدین الھیثمی، مرکز خدمۃ النساء والسیر ۃ النبویۃ، المدینۃ المنورۃ، ۱۴۱۳/۱۹۹۲ئ، ج ۲، ص ۶۸۴، حدیث: ۶۶۲

۶۵۔ سنن البیہقی الکبریٰ، ج ۹، ص ۸۴، حدیث: ۱۷۹۰۱،

۶۶۔ کتاب الرد علی سیر الاوزاعی، ج ۱، ص ۸۲

۶۷۔ حوالہ سابق، ص، ۸۷

۶۸۔ المبسوط للسرخسی، ج ۱، ص ۱۳، کتاب الرد علی سیر الاوزاعی، حاشیہ الافغانیؒ، ج ۱، ص ۸۲،

۶۹۔ صحیح مسلم، :۳۰۰۹، کتاب الرد علی سیر الاوزاعی، حاشیۂ الافغانیؒ، ج ۱، ص ۹۶، احکام القرآن للجصاص، ج ۱، ص ۴۷۱

۷۰۔ السیر الصغیر للامام محمد، ج ۱، ص ۱۹، تحقیق و تعلیق، د۔ محمود أحمد غازی، مجمع البحوث الاسلامیۃ، الجامعہ الاسلامیۃ العالمیۃ، اسلام آباد، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸م، لسان الحکام فی معرفۃ الاحکام، ابراھیم بن آبی الیمن محمد الحنفی البابی الحلبی القاھرۃ، ۱۳۹۳ھ/ ۱۹۷۳ئ، ج ۱، ص ۳۸۱،

۷۱۔ البیان والتحصیل، ابن رشد القرطبی، تحقیق: د۔ محمد حجی، دار الغرب الاسلامی، بیروت۔ لبنان ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸م، طبع دوم، ج ۱۶، ص ۶۴۳، تھذیب مسائل المدوّنہ، أبو سعید خلف أبی قاسم القیر وانی، تحقیق و تعلیق: أبو الحسن احمد فرید المزیدی، ج ۱، ص ۲۴۸، مواھب الجلیل لشرح مختصر الخلیل، الحطاب الرعینی، المحقق: زکریا عمیرات، دار عالم الکتب ۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۳ئ، ج ۴، ص ۳۲۰، الام ج ۶، ص ۱۶۴، الحاوی فی فقہ الشافعی، ج ۱۳، ص ۱۶۸

☆☆☆

وقت کے ایک اہم اور زندہ موضوع پر قابلِ قدر تصنیف

غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق

مولانا سید جلال الدین عمری

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں؟ یہ آج کا ایک اہم اور زندہ موضوع ہے۔ کیا اسلام اپنے ماننے والوں کے علاوہ دوسروں کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دیتا ہے؟ کیا اس میں مذہبی رواداری، تحمل و برداشت اور توسع نہیں پایا جاتا ہے؟ اسلام کے نزدیک غیر مسلموں سے خاندانی، معاشرتی، سماجی، کاروباری اور ازدواجی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں کو سلام، مساجد میں ان کا داخلہ اور ان سے تحائف کے تبادلہ کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمانوں کے معاملات میں ان کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے؟ اسلامی ریاست کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور اس پر کیا اعتراضات کیے جاتے ہیں؟ جہاد کیا ہے اور اس کے احکام کیا ہیں؟ ذمیوں کے کیا حقوق ہیں؟ اسلامی ریاست کے بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں سے عدم تعلق کی ہدایات کا صحیح پس منظر کیا ہے؟ یہ چند ایسے اہم مسائل ہیں جن کا جدید ذہن اطمینان بخش جواب چاہتا ہے۔

کتاب میں اس نوع کے تمام مباحث پر قرآن وحدیث کی روشنی میں اور مستند مفسرین، محدثین اور فقہاء کے حوالوں کے ساتھ عالمانہ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے پس منظر میں اس کی خصوصی اہمیت ہے اور دعوت و تبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کی بھی یہ ایک اہم ضرورت ہے۔

مصنف کی نظر ثانی کے بعد جدید ایڈیشن، آفسیٹ کی حسین طباعت، عمدہ کاغذ، خوب صورت جلد، صفحات: ۳۲۰، قیمت: ۱۸۵/- روپے

ترجمہ و تلخیص

مغرب کو اسلام کا تحفہ

(ایک یورپی مسلمان کے احساسات)

احمد وون ڈِنفر

مترجم: ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

ڈاکٹر احمد وون ڈنفر (Ahmad von Denffer) جرمنی کے مشہور دانش ور ہیں۔ انھوں نے مینس یونی ورسٹی سے علم بشریات (Anthropology) میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ وہ اسلامک فاؤنڈیشن لیسسٹر، برطانیہ میں ریسرچ فیلو رہے ہیں، جہاں انھوں نے 'مسلم عیسائی تعلقات پر مطالعات' کے عنوان پر تحقیقی کام کیا ہے۔ اس وقت وہ انٹرنیشنل کونسل فار انفارمیشن، برطانیہ کے اعزازی نائب صدر ہیں۔ ان کی متعدد کتب و رسائل اسلامک فاؤنڈیشن سے شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر ڈنفر نے دعوہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد میں ایک خطبہ دیا تھا، جو بعد میں سہ ماہی Insight اسلام آباد، جلد ۳، شمارہ ۲۔۳ (Winter 2010, Spring 2011) میں شائع ہوا۔ کسی قدر تلخیص کے ساتھ اس کا ترجمہ ہدیۂ قارئین ہے۔
(مترجم)

اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے قبل میں تین باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں:

اسلام اور مسلمانوں کی زندگی میں تضاد

اولاً: اگر آپ میرے ملک جرمنی میں کسی غیر مسلم سے یہ سوال کریں کہ اسلام کے پاس یورپ کو پیش کرنے کے لیے کیا ہے؟ تو شاید اس کا جواب ہو: کچھ نہیں۔ اس

جواب کی جڑ اس حقیقت میں پیوست ہے کہ جرمنی کی اکثریت اور شاید دیگر مغربی ممالک اسلام کو عدم تحمل ،تشدد، جہالت اور پچھڑے پن سے جوڑ کر دیکھتے ہیں ۔ اسلام کی یہ شبیہ، جو میڈیا اور سیاست کی پشت پناہی سے مسلسل پیش کی جا رہی ہے، حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ میں مضبوط دلائل کے ساتھ اس کی حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں ۔ ہر شخص کو یہ فرق ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اسلام اور مسلمانوں کا طرز معاشرت دو الگ الگ چیزیں ہیں ۔ بہ الفاظ دیگر اسلام کو مسلمانوں کے رویوں کے ذریعہ نہیں جانچا جا سکتا ،جب کہ مسلمانوں کے رویوں کی اصلاح کرنے اور انھیں اسلامی تعلیمات کے پیرائے میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ تاہم اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ مصنوعی جواب تمام غیر مسلموں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اگر چہ شاید وہ آپ کے ساتھ اس بات پر اتفاق کر لیں کہ اصولوں اور عملی نمونوں کے درمیان فرق مذہب ،فکر یا تصور کائنات میں پایا جاتا ہے ۔ ایسی صورت میں اپنے مذہب کی بہترین پیش کش اور صبر و تحمل کے ذریعہ ہم انھیں مطمئن کرنے میں کام یاب ہو سکتے ہیں ۔یعنی یہ کہ اسلام، منفی پروپیگنڈے کے علی الرغم، مغرب کے سامنے بے شمار چیزیں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہمارے غیر مسلم بھائی یقینا یہ سوال کرنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ اگر ایسی بات ہے تو مسلمان اپنی زندگی میں اسلامی تعلیمات کو کیوں نہیں اتارتے ؟ یا دوسرے الفاظ میں ان کا یہ مطالبہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان جن چیزوں کی تبلیغ کرتے ہیں ان کا عملی مظاہرہ ہو خود کیوں نہیں کرتے ؟

میرا احساس ہے کہ اب ہم اس گفتگو کے ذریعہ اپنے اصل ہدف تک پہنچ چکے ہیں ۔ جب بھی ہم مسلمانوں کے بین الاقوامی مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں، اسی نتیجے تک پہنچتے ہیں ۔ یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ میں اتہام والزام تراشی کے بکھیڑے میں نہیں الجھنا چاہتا۔ بجا طور پر یہ سوالات ہمیں ان بہت سی قرآنی آیات کی یاد دلاتے ہیں، جن میں اعمال اور رویوں کی تضاد بیانی پر نکیر کی گئی ہے۔ (الصّف:۲ ۔ ۳) اور اس حقیقت کا سراغ لگتا ہے کہ اقوال اور دعوؤں کے لیے عملی

نمونوں کی بہر حال ضرورت ہے۔ہم مسلم دنیا کے اندر موجود قول وفعل کے تضاد کو جس انداز سے بھی پیش کریں اس حقیقت سے منھ نہیں موڑ سکتے کہ جب تک ہم اس کھائی کو پاٹنے میں کام یاب نہیں ہوجاتے یا شعوری طور پر اسے کم کرنے کی کوشش نہیں کرتے، ہم کسی کو بھی متاثر اور متوجہ نہیں کر سکتے۔قبل اس کے کہ ہم اس سوال پر غور کریں کہ اسلام مغرب کو کیا تحفہ دے سکتا ہے؟ ضروری ہے کہ خود مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں، جو عصر حاضر میں اسلام کے نمائندے تصور کیے جاتے ہیں۔ ہمارے لیے اس پہلو پر غور کرنا انتہائی ضروری ہے کہ اپنے ارد گرد رہنے بسنے والے غیر مسلم بھائیوں کا اعتماد اور یقین کس طرح حاصل کریں، تاکہ وہ اسلام کی تعلیمات پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہوسکیں اور اسلام کو وہ اپنے لیے مفید سمجھیں اور اس کو خوش آمدید کہہ سکیں۔کبھی کبھی یہ پہلو ان کے سامنے مخفی ہوتا ہے، کیوں کہ ان سے اس بات کی توقع عبث ہے کہ وہ اسلام کی خوب صورت حقیقت کو خود سے جان سکیں گے، بالخصوص جب کہ مسلمانوں کی خوف ناک تصویر کے پیچھے یہ حقیقت گم ہو کر رہ گئی ہو۔

اسلام۔ تمام انسانیت کا نجات دہندہ

ثانیاً: بڑے پیمانے پر یہ غلط فہمی عام ہوچکی ہے کہ اسلام کا پیغام چودہ سو سال قبل محمد عربی ﷺ کے ساتھ دنیا میں پہلی بار آیا تھا، حالاں کہ صحیح بات یوں کہی جانی چاہیے کہ وہ اللہ کے تمام سچے نبیوں اور رسولوں کی معرفت دنیا میں ابتدا سے آتا رہا ہے۔اس بنا پر وہ ایک آفاقی پیغام ہے۔قرآن، جس کی تعلیمات کا اظہار اور نفاذ حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ ہوا، وہ آخری پیغام ہے اور گزشتہ تمام رسولوں کے پیغامات وتعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ بھی ہے۔ اس سے یہ بات پورے طور پر واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام کے عطایا صرف مغرب کے لیے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ اس کا فیض تمام انسانیت کے لیے عام ہے۔میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں اس نکتہ کو اپنی گفتگو میں فراموش نہیں کرنا چاہیے، بلکہ بہ طور خاص اس کا اظہار کرنا چاہیے۔یہ بات اب روزِ روشن کی طرح عیاں ہوچکی ہے اور وسیع تناظر میں قابلِ قبول بھی ہے

کہ پوری دنیا ایک گاؤں کی مانند ہو چکی ہے ۔ اب جب کہ گلوبلائزیشن کے منظر نامے کا انکار کسی کے بس میں نہیں رہا تو تبلیغ اسلام کی ضرورت کو ہم صرف مغرب ہی تک کیوں محدود کریں؟ چنانچہ اب اگر ہم یہ بات کر رہے ہیں کہ اسلام مغرب کو کیا پیش کر سکتا ہے؟ تو اس کا محض یہ مفہوم ہونا چاہیے کہ چوں کہ ہم مغرب میں زندگی گزار رہے ہیں، اس لیے ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اپنے درمیان زندگی گزارنے والوں کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کردیں ۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ اسلام کے پاس عطا کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں بچا ہے ۔ اس کے برعکس یہ حقیقت بالکل واضح رہنی چاہیے کہ جو کچھ اسلام عطا کرتا ہے وہ چند بنیادی حقائق ہیں، خواہ انھیں مغربی تناظر میں پیش کیا جائے یا کسی دوسرے سیاق میں ۔

امن کا پیغام

ثالثاً: اسلام امن کا ایک پیغام ہے۔ واضح رہے کہ لفظ 'اسلام' کا انتہائی موزوں ترجمہ 'امن کی نشوونما کرنا' یا 'امن کو قائم کرنا' ہے۔ اسے صرف اللہ کے سامنے جھکنے یا اس کی اطاعت تک محدود نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات ہمارے سامنے واضح رہنی چاہیے کہ اسلام کا تصور جھکنے اور اطاعت قبول کرنے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا، تاہم صرف اتنی سی بات سے لفظ 'اسلام' کے حقیقی مفہوم کی مکمل ترجمانی نہیں ہو پاتی ۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا راستہ تصور امن ہی سے ہو کر گزرتا ہے اور اس میں بھی کلام کی گنجائش نہیں کہ مسلم ماہرین لغت اور مفسرین کی ایک معتد بہ تعداد نے اسی تصور کو اپنی کتابوں میں درج اور رائج کیا ہے ۔(مثلاً ملاحظہ کیجیے لسان العرب، ابن منظور، مادہ سلم)

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں لفظ اسلام کو زندگی کے ایک ایسے طریقے سے تعبیر کرنا چاہیے جس کا مقصد امن کا قیام ہے ۔ دیگر مذاہب میں بھی اس سے ملتے جلتے تصورات پائے جاتے ہیں، مثلاً عیسائیت میں محبت اور بدھ مت میں برداشت کرنے کا تصور۔ مجھے اس امر میں قطعی شبہ نہیں ہے کہ اسلام کی توہین کرنے کے بعد کبھی بھی قیام امن کا تصور ممکن نہیں ہے۔ اسلام کے بنیادی تصور امن کا مطلب خدا اور بندے

کے تعلق کی وضاحت کرنا ہے ۔ اس طرح اسلام کا مفہوم جھکنا اور خالق کی اطاعت کرنا ہے، کیوں کہ خالق کے ساتھ امن کی حالت میں زندگی گزارنا تب ہی ممکن ہے جب اس کی مرضی کی پیروی کی جائے۔ اسی صورت میں خالق کے ساتھ بندے کا تعلق خوش گوار ہوسکتا ہے اور تبھی دیگر شعبوں میں بھی امن قائم ہوسکتا ہے۔ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اسلام چاہتا ہے کہ آپ کا تعلق پہلے خالق کے ساتھ، پھر خود آپ کے نفس کے ساتھ، دوسرے انسانوں کے ساتھ، معاشرے کے ساتھ، الغرض پوری دنیا کے ساتھ امن والا ہونا چاہیے۔

اب میں اصل موضوع پر آتا ہوں اور پورے اعتماد کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام تحفہ میں بہت کچھ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جی ہاں، مغرب کو بھی!

خالق کے ساتھ امن

سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک آفاقی تصور رکھتا ہے ۔ وہ دیگر تصورات کے بالمقابل پوری مضبوطی کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے، کیوں کہ دیگر مذاہب میں تبدیلی کا عمل برابر جاری رہتا ہے، تاکہ ان کو مسلسل تبدیل ہونے والی سماجی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا جاسکے۔ اب جب کہ یہ کوئی اختلافی موضوع نہیں رہا کہ انسانی سماج ارتقاء پذیر ہے اور اس میں مسلسل تبدیلی ہورہی ہے، ایسی صورت میں اصل سوال یہ ہے کہ ہمارا اصولی موقف سماجی تبدیلی کے تابع ہوگا یا سماجی تبدیلی کو ہمارے اصولی موقف کے تابع ہونا چاہیے؟ اسلام اس سلسلے میں موخر الذکر نقطۂ نظر کی تائید کرتا ہے۔

زندگی میں عقیدے کی بالادستی

عقیدے کی پختگی کو اسلام میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ مسلمانوں کے رویوں سے بھی اس کا اظہار ہونا چاہیے۔ اگرچہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ اسلام اور اس کے نمائندوں کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے، اس کے باوجود مسلمانوں اور اسلام کے اکثر ناقدین کا خیال ہے کہ مسلمان دوسروں کی بہ نسبت جدید دنیا کے مطابق اپنے کو ڈھالنے میں سخت گیر واقع ہوئے ہیں، کیوں کہ عقیدے سے وابستگی کے گہرے

آثار ان کی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ اس یکسوئی نے دوسروں کو اقدار پر مبنی مسلمانوں کے رویوں کے مطالعہ کی رغبت پیدا کی ہے، خواہ ان کا تعلق مذہبی امور سے ہو یا غیر مذہبی مسائل سے۔ مثال کے طور پر ان بیانات کو پیش کیا جا سکتا ہے جو مذہبی اختلافات کے باوجود بین المذہبی مکالموں میں شریک ہونے والے افراد کی زبانی سامنے آتے ہیں کہ بہ حیثیتِ انسان مسلمانوں کی زندگیاں عقیدے میں پختگی کی شاہ کار ہوتی ہیں۔ جرمنی کے سیاسی گلیاروں میں بھی ان باتوں کی بازگشت سننے کو ملتی ہے، جہاں مہاجرین اور مسلمانوں کو قومی دھارے میں سمونے کی بحثیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ عقیدے کے معاملے میں مسلمانوں کی جذباتیت اور مذہب سے ان کا لگاؤ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو اسلام کے نظامِ اقدار پر از سرِ نو غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ کوئی سیاسی نمائندہ ایسا نظر نہیں آتا جو یہ سوال اٹھاتا ہو کہ جرمنی کی نمائندہ تہذیب (Let Kulture) کو کس طرح ڈھالا جائے کہ مسلمان اور دیگر مذاہب کے پیروکار اس میں داخل ہو سکیں۔

Bavarian (جرمنی کا ایک صوبہ) پارلیمنٹ میں حالیہ دنوں میں اس پر بحث جاری تھی کہ ایک ایسا قانون وضع کیا جائے جو مذہبی علامات کا تحفظ کر سکے اور گالی، توہین اور مضحکہ خیزی کے مقابلہ میں یقین و اعتماد کی فضا پیدا کر سکے۔ اس میں شک نہیں کہ عیسائی جنون کی موجودگی کے باوجود اس پہل کو مسلمانوں نے خوش آمدید کہا۔ ڈنمارک اور دوسرے مقامات پر کارٹونوں کی تشہیر پر ان کا ردِ عمل اس کی دلیل ہے۔

عظیم ہستی کے سامنے جواب دہی کا احساس

تصورِ کائنات کے بارے میں اسلام کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اس کائنات کا مالک انسان نہیں، بلکہ رب العالمین ہے۔ (الفاتحہ:۱، البقرۃ: ۳) اس عقیدہ سے جواب دہی اور ذمہ داری کا تصور ابھرتا ہے کہ انسان کے مقابلے میں کوئی عظیم ہستی اس کی سزاوار ہے۔ اس تصور کے نتیجہ میں ایک مضبوط و مستحکم اصول وضع ہوتا ہے، وہ یہ کہ احساس ذمہ داری کچھ بنیادی اصولوں اور ضابطوں کی متقاضی ہے، جن کے

ذریعہ انسانوں کے اعمال اور رویے جانچے پرکھے جاسکتے ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ یہ اصول اور ضابطے انسان نہیں وضع کرسکتا، بلکہ یہ اس ذات کی طرف سے نازل کردہ ہیں جس کو جواب دہی کرنی ہے۔ اسی ہستی کو اللہ رب العالمین یعنی جہانوں کا مالک کہا جاتا ہے۔ (البقرۃ:۳۸۔۳۹)

الکحل اور منشیات سے آزاد زندگی

بلا شبہ ایسی ڈھیروں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دوا میں الکحل کی آمیزش سے افراد اور مجموعی طور پر پورا سماج پریشانیوں سے دوچار ہوجاتا ہے۔ دوا کی عادت دوا کے استعمال کا سبب ہے، دوا بذات خود اپنے وجود کا سبب نہیں ہے۔ اس ضمن میں روس کی مثال پیش کی جاسکتی ہے، جہاں تیز نشہ آور شراب کا استعمال قدیم رواج کے مطابق وسیع پیمانے پر جاری ہے اور شراب نوشی سے تشفی کا احساس انسانوں کو ایک ایسی حالت میں ڈھکیل دیتا ہے جہاں پہنچ کر ان کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ زندگی کے تلخ حقائق کا ادراک کرنے سے عاری ہیں۔ روس میں اکثر انفرادی طور پر معاشی تنگی ہونے اور اس سے نہ نکل پانے کے نتیجہ میں لوگ شراب نوشی کے عادی بن جاتے ہیں۔ دوسرے ممالک کے لوگ اگرچہ خوش حال زندگی گزارتے ہیں، تاہم وہ بھی نشہ آور اشیاء کا استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کی تلخیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی دوائیں استعمال کرتے ہیں۔

اسلام ایک ایسی زندگی اور معاشرہ عطا کرتا ہے جس میں الکحل اور منشیات کا گزر نہیں ہے۔ یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ پوری دنیا میں صرف مسلمان ہی مضبوطی کے ساتھ نشہ آور اشیاء کے تعلق سے اسلامی احکام پر عمل پیرا ہیں، تاہم اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ موجودہ دور میں نشہ سے بچنے والی قوم مسلمان ہی ہے۔ مزید برآں متعدد مسلم ممالک الکحل اور منشیات کی روک تھام کے لیے قوانین وضع کرتے ہیں، تاکہ ان کے نقصانات اور ہلاکت خیز اثرات سے محفوظ رہا جاسکے۔ بلا شبہ اس طرح کی قانون سازی اور الکحل ومنشیات سے دور رہنے کی فکر رکھنے والے سماج میں نہ

صرف پریشانیوں میں کمی آئے گی، بلکہ معاشی تنگی سے بھی چھٹکارا حاصل ہوگا، جب کہ الکحل اورمنشیات استعمال کرنے والے سماج میں دونوں مسائل باقی رہیں گے ۔

عصر حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کی بہتر تفہیم کرنا عظیم خدمت ہوگی۔ اگر ایک کمیٹی ،جو ماہرین معاشیات ،سماجی کارکنوں اور محکمہ صحت پر مشتمل ہو، سنجیدگی سے اس مسئلے پر تحقیق کرے اور صحیح اعداد وشمار کی روشنی میں یہ معلوم کرے کہ سماج پر پڑنے والے عمومی اخراجات کی کیفیت کیا ہے؟ اور اس بات کا اندازہ لگائے کہ مثلاً اگر برطانیہ اور جرمنی جیسے یورپی ممالک کے تمام مسلمان الکحل اور نشہ آور اشیاء استعمال کرنے لگیں تو کیا وہ اس ملک میں آباد غیر مسلم آبادی کے ذریعہ ہونے والے الکحل کے اخراجات کے برابر دولت صَرف کرسکیں گے؟ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ اگر کسی طرح اس طرح کی تحقیقی رپورٹ فراہم بھی ہو جائے تو اس کا واقعی اعتبار واستناد قائم نہیں ہوسکتا، کیوں کہ بیش تر غیر مسلم ممالک میں حکومتی محاصل کا اکثر حصہ الکحل کی پیداوار اور اس کے استعمال سے حاصل ہوتا ہے۔ اس وضاحت سے ہر معقول آدمی کے سامنے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ مسلمان بالعموم الکحل اور منشیات کا استعمال نہیں کرتے، چنانچہ وہ حادثات اور جرائم، نیز الکحل کے استعمال کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بیماریوں سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کی اکثریت کو بے تحاشا مالی صرفہ سے بچانا ضروری ہے، تاکہ بیماریوں پر آنے والے مالی بوجھ پر یہ بچت صرف کی جاسکے۔

انسانیت کے ساتھ امن وآشتی کا معاملہ

اسلام کی برکت کے طفیل مسلم امت انسانی سماج کے اندر پُرامن اور خوش گوار تعلق کے قیام کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ اس مقصد کی بجا آوری میں انسانوں کے تمام معاشروں کو شراکت داری نبھانی چاہیے، بالخصوص وہ لوگ جو اپنے کو عقیدے والا گروہ کہتے ہیں۔ اس مقام پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ پُر امن اور خوش گوار ہم آہنگی کے قیام اور اس کے طریقوں کے سلسلہ میں آراء کا اختلاف

پایا جاتا ہے۔ کچھ مخالفین اسلام کو وضعی اور قانونی طریقہ زندگی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ قوانین رکھنا اوران کی حفاظت کرتے ہوئے شہریت اختیار کرنا آج صرف اس صورت میں ممکن تصور کیا جاتا ہے جب کہ یہ قوانین سیکولر ہوں اور مذہب کی بالادستی نہ قبول کرتے ہوں۔ یقینا اسلام محض قانون سازی کی بات نہیں کرتا، بلکہ اس کے سلسلے میں رہ نمائی بھی فراہم کرتا ہے۔

مستحکم خاندانی روابط کی بازیافت

اسلام قانون کا ایک مکمل ڈھانچہ عطا کرتا ہے جو مردوں اور عورتوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت واضح کرتا ہے اور سماج کے اندر خاندان کی نوعیت، کردار اور کارکردگی کے ضوابط اور شرائط بھی متعین کرتا ہے۔

سماجی علوم کے اساتذہ نے ایک دہائی قبل یورپی معاشروں مثلاً جرمنی کی ایک تکلیف دہ صورت حال کا ذکر کیا تھا اور آج پھر سیاسی لیڈر، اگرچہ تاخیر ہی سے سہی، اس مسئلہ پر سوچ بچار کرنے لگے ہیں۔ وہ ہے آبادی میں تخفیف (Population decline) کا مسئلہ۔ اس کے متعدد وجوہ میں سب سے تازہ اور جدید فیملی پلاننگ کا طریقۂ کار ہے، جس نے نہ صرف ہر فیملی میں شرح پیدائش میں کمی کردی ہے، بلکہ خاندانوں کو بھی کم کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کیفیت کو، جسے ماضی میں Average family کہا جاتا تھا (یعنی شوہر، بیوی اور دو تین بچے) اسے آج نارمل فیملی نہیں سمجھا جاتا۔ آج صورت یہ ہے کہ اکثر لوگ ایک شادی بھی نہیں کرتے، جو لوگ شادی کرتے ہیں ان میں پچاس فی صد لوگ ایک یا دو سال میں طلاق دے دیتے ہیں اور پیدا ہوجانے والے بچے اکلوتے والدین والے خاندان (Single Parent family) ہی کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اسلام مستحکم خاندانی رشتوں کو استوار کرتا ہے اور اس ضمن میں معقول اصول دیتا ہے۔ یورپی معاشروں میں آبادی میں تخفیف کا مسئلہ اولاً اقتصادیات سے جڑتا ہے، ثانیاً اس کی حیثیت سماجی مسئلہ کی بھی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے حل کے لیے جو اصول

وضوابط وضع کیے جاتے ہیں وہ بھی سب سے پہلے معاشیات سے متعلق ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نوعمروں کی کم تعداد بزرگوں کی بڑی تعداد کو تحفظ فراہم نہیں کرسکتی۔نئی نسل کی کم تعداد کا مطلب یہ ہوگا کہ مستقبل میں خریدار اور گاہک کی تعداد بھی کم ہوجائے گی۔اس طرح سے یہ معاشی خسارے کا سودا ہوگا۔ اس آسان منطق کی رو سے جرمنی میں آج کی اتحادی حکومت یہ نتیجہ نکال رہی ہے کہ خاندانی وظیفہ (Parent Money) کی شکل میں راتب کی تقسیم مسئلہ کا ایک حل ہے۔ ۱۳؎ اور بچے رکھنا افزائش وترقی کی ایک ایسی قسم ہے جو صنعت کاری کی مانند ہے۔

یہ بات بجا طور پر قابل یقین ہے کہ بچے بے قیمت نہیں ہوتے۔ انسانی نسل کی افزائش کے لیے متعدد شرطیں مطلوب ہیں، جو بہر حال صنعتی پیداوار سے جدا ہیں۔ اسلامی نظریہ صنفی تفریق پر مبنی نہیں ہے اور محض لفظی مساوات کے مفروضے پر نہیں قائم ہے، بلکہ اس میں فطری اختلافات کو اہمیت دیتے ہوئے دونوں صنفوں کو الگ الگ ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں، تاکہ دونوں ایک دوسرے کا تکملہ ثابت ہوں، نہ کہ ایک دوسرے کو اس کے مقام سے ہٹانے والے بن جائیں۔شادی کے عہد وپیمان کے ذریعہ شوہر اور بیوی کے درمیان حقوق وفرائض کا خوب صورت تعلق قائم ہوتا ہے اور دونوں کی ضروریات اور ذمہ داریوں کا چارٹر طے ہوتا ہے۔ اس تعلق کے ذریعہ ایک ایسی فضا استوار ہوتی ہے جس میں بچے معاشی بوجھ تصور نہیں کیے جاتے، بلکہ انھیں خوشیوں کی سوغات سمجھا جاتا ہے۔

سود کے بغیر معاشی جدو جہد

آخر میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام دنیا کے سامنے چند طریقے اور مناہج پیش کرتا ہے، تاکہ انسانوں اور دیگر تمام مخلوقات کے درمیان پُرامن رشتے بحال ہوسکیں۔اس ضمن میں ایک بار پھر میں معاشی پہلو کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، کیوں کہ غیر مسلم سماج میں اس کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ہم ایک ایسی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں جس میں معاشی مفادات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور اکثر وبیشتر فطری وسائل وذخائر اور طاقت وقوت پر قبضہ کے تعلق سے جنگیں تک چھڑ جاتی ہیں۔